BA Part - III

Paper - VIII

اردو مثنوی نگاری اور اس کا ارتقاء

مثنوی ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی دو دو کے ہیں اور اصطلاح میں ان اشعار کو کہتے ہیں جن میں دو مصرعے آپس میں مقفی ہوں۔ یہ طویل نظم کی ایک قسم ہے۔ اس کو ہم منظوم داستان یا منظوم کہانی بھی کہہ سکتے ہیں۔

مثنوی کے متعلق حالی کے نظریات :-

"مثنوی اصناف سخن میں سب سے کارآمد اور مفید صنف ہے۔ کیوں کہ مضامین کے لحاظ سے جو وسعت اس صنف شاعری کو ہے کسی اور کو نہیں"۔

مثنوی کا ہر شعر اپنے دونوں مصرعوں میں ہم قافیہ ہوتا ہے۔ مثنوی کے مضمون میں بڑی وسعت ہوتی ہے۔ اس میں جن، پری کے قصے، مافوق الفطری واقعات سے لے کر عام انسانوں کے حسن و عشق کی وارداتوں، خوشی و غم، رسم و رواج اخلاق و معاشرت، تمدن و سیاست اور مسائل تصوف بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ اس وسعت کی وجہ سے صنف شاعری میں مثنوی ایک اہم و امتیازی حیثیت کی حامل صنف ہے۔ مثنوی کے اشعار کی تعداد محدود نہیں ہے۔ مسلسل طویل مثنویوں میں جیسے "شاہ نامہ فردوسی" اور "مثنوی معنوی" میں ایک لاکھ سے زیادہ اشعار ہیں۔ مضامین کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ اس لئے مثنوی میں عشقیہ، رزمیہ، بزمیہ، تصوف اور فلسفہ وغیرہ ادا کئے جاتے ہیں۔ مثنوی نگار عموماً آسان بحروں میں مثنوی کو پیش کرتے ہیں۔ اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے مثنوی میں آغاز سخن کی شکل میں حمد باری تعالیٰ ہوتا ہے۔ اس کے بعد بالترتیب نعت، منقبت، مناجات، مدح حاکم، تعریف سخن، سبب تالیف اصل قصہ وغیرہ ہوتا ہے۔

عام طور پر مثنوی کی ابتداء اللہ کی تعریف سے ہوتی ہے۔ پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نعت پیش کی جاتی ہے۔ نعت کے بعد عموماً حضرت علی کی شان میں منقبت کا رواج ہے۔ اس کے بعد مثنوی نگار چند مسلسل مربوط اشعار لکھ کر اپنے موضوع مثنوی کی طرف گریز کرتا ہے اور اس کے بعد واقعات و خیالات کا اظہار شروع کرتا ہے۔ مثنوی کی معنویت قصہ پر منحصر ہوتی ہے۔

اردو میں مثنوی فارسی ادب سے منتقل ہوئی ہے۔ اس لئے اردو مثنوی میں بھی صوری معنویت اور محاسن وغیرہ فارسی سے ماخوذ ہے۔ فارسی مثنوی میں فردوسی کے شاہ نامہ، علامہ سعدی کی کریما اور مولانا روم کی مثنوی معنوی کو شہرت ہے۔

اردو شاعری فارسی ادب کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے۔ اس کے قدیم نمونے گرچہ دکنی زبان میں ملتے ہیں۔ اس وقت شمالی ہند میں اردو زبان کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہوا تھا۔ دکن میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں۔ خیال ہے کہ سب سے قدیم اردو مثنوی دکن میں قطب شاہ نے لکھی تھی۔ اس کے بعد متعدد مختلف مثنویاں لکھی گئیں جس میں غواصی کی مثنوی "سیف الملوک" اور "بدیع الجمال" ہے۔ جس کی اشاعت ۱۰۳۵ھ میں ہوئی۔

علی عادل شاہ کے عہد سلطنت میں تو کئی مثنویاں لکھی گئیں جس میں "علی نامہ" بہت مشہور ہے۔ اس میں علی عادل شاہ کے فتوحات کا تذکرہ ہے۔ اسی زمانہ میں ملا ہاشمی نے "یوسف زلیخا" کے قصہ کو مثنوی میں پیش کیا۔

اس کے بعد فقیر ابو بحری نے ۱۱۱۲ھ میں "من لگن" صوفیانہ طرز کی مثنوی لکھی۔ ملا وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" اور ولی دکنی کی مثنوی "شہدائے کربلا" سے متعلق ہے۔

شاہ مبارک آبرو اور مولوی سید محمد نے مثنویاں لکھیں لیکن ان کو شہرت حاصل نہ ہو سکی۔ سراج الدین اورنگ آبادی کی مثنوی بوستان آج دو سو سال کے بعد بھی ادبی حسن کے لحاظ سے قابل تعریف ہے۔

نمونہ کلام :-

ہر اک سمت پانی کی نہروں کی سبیل — وہ نہروں کے لہروں کے پانی کی سبیل

ہر اک سرو پر عشق پیچاں کی بیل — خوشی کے گلے میں تھی گویا حمیل

جھکی ڈالیاں بید مجنوں کی جھیں — خم زلف لیلیٰ کے مجنوں کی تھیں

BA Part - III

Paper VIII

اردو مثنوی نگاری اور اس کا ارتقاء

CLASSMATE
Date : 2
Page :

جب شمالی ہند میں اردو کو فروغ حاصل ہوا تو میر اور مرزا نے اردو غزل کو بام عروج تک پہنچایا۔ اس وقت سودا نے کچھ مثنویاں لکھیں انہوں نے مدحیہ مثنوی بھی لکھی ہے اور عشقیہ مضامین والی مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ ان کی مثنویوں کی زبان انتہائی شگفتہ اور دل پذیر ہے۔

شام سے صبح تک یہی ہے شور
وہ جو گھوڑی ہے چلا ہے چور

اسی عہد میں میر تقی میر نے واردات عشق کی بڑی اچھی تصویر ~~کشی~~ مثنویوں میں پیش فرمائی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میر کو جب رونے رلانے سے فرصت مل جاتی تو بالقصد مثنوی لکھنے بیٹھتے تھے۔

زمانے میں ہے اسم کہنے کی کچھ
امید اس پہ ہے نام رہنے کی کچھ

میر تقی میر کی کل ۳۲ مثنویاں ملتی ہیں۔ ان کی تمام مثنویوں کا موضوع عشق ہے جیسے (۱) اعجاز عشق (۲) شعلہ عشق (۳) دریائے عشق (۴) جوش عشق (۵) معاملات عشق وغیرہ۔

میر شیر علی افسوس کے کلیات میں ایک مثنوی ملتی ہے جس کا نام "بہار سخن" ہے۔ اسی زمانے میں نواب محبت خان نے "اسرار محبت" کے نام سے ایک مثنوی ۱۷۸۲ء میں لکھی تھی۔ یہ مثنوی عشقیہ افسانے کی ایک قسم ہے۔

دلشاد دہلی کی تباہی و بربادی کے بعد جب لکھنؤ ایک ادبی مرکز کی صورت میں ابھر کر سامنے آیا تو یہاں بھی اگرچہ اخلاقی قدروں کی ~~شکست~~ شکست و ریخت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مگر دولت کی فراوانی تھی اور عیش و آرام کے ماحول نے معاشی طور پر ایک پرسکون فضا پیدا کر رکھی تھی۔ یہ ماحول مثنوی نگاری کے لئے بہت مناسب تھا۔ میر حسن نے مثنوی "سحر البیان" ۱۷۸۵ء میں آصف الدولہ کے دور میں لکھی۔

اسی طرح اس مثنوی میں ہر مقام پر دربار کا رنگ، محلات شاہی کی تصویریں، چہل پہل، قہقہے اور وہی رنگ رلیاں نظر آتی ہیں۔ جو اس زمانہ میں محلوں میں ہوا کرتی تھیں۔ کرداروں کے حرکات و سکنات افعال اور جذبات میں بھی محلوں کے داخلی نقش و نگار ہیں۔

کناروں کے جوڑے دمکتے ہوئے
وہ پائوں کے گھنگھرو چھنکتے ہوئے
وہ بالے چمکتے ہوئے کان میں
پھر کنا وہ نتھنے کا ہر آن میں

میر حسن کو خود اپنی مثنوی شاعرانہ خوبیوں کا احساس تھا اور اپنی طرز ادا پر وہ بجا ناز فرماتے ہیں۔

رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام
کہ ہے یادگار جہاں یہ کلام

مثنوی سحر البیان کی دلکشی اور شیریں بیانی کے متعلق اردو کے مشہور نقاد کلیم الدین احمد فرماتے ہیں:

" مثنوی سحر البیان میں طرز ادا سب سے زیادہ اہم ہے۔ عبارت صاف پاکیزہ اور بامحاورہ ہے۔ شیریں

اردو مثنوی نگاری اور اس کا ارتقاء

اور ترنم کی بھی کمی نہیں۔ الفاظ ترنم اور ملائم استعمال ہوئے ہیں۔ میر حسن نے فصیح زبان کو پورا کر مثنوی میں رکھ دیا ہے۔

خود میر حسن کا اپنا دعویٰ درست ہے شعر

نہیں مثنوی ہے یہ ایک پھلجھڑی
مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی

سحر البیان کے علاوہ میر حسن نے کئی مثنویاں لکھی ہیں جن میں مثنوی گلزار ارم بہت مشہور ہے۔ یہ ۱۷۷۸ء میں لکھی گئی ہے۔ "گلزار ارم" ایک تاریخی مثنوی ہے۔ دہلی سے ہجرت کے بعد فیض آباد اور لکھنؤ میں قیام کے زمانے میں یہ مثنوی لکھی گئی ہے۔ لکھنؤ شہر کے شرفاء کی مذمت اس مثنوی کے خاص موضوعات ہیں۔ فنی اعتبار سے اس مثنوی کو شہرت حاصل نہیں ہے۔ لکھنؤ کے شعراء میں مصحفی کی شاعری میں ۱۰ عدد مثنویاں ملتی ہیں۔ جن میں چار مثنوی کو زیادہ شہرت حاصل ہے۔ "شعلۂ عشق، جذبۂ عشق، گلزار شہادت" یہ مثنویاں ۱۷۸۵ء کے قریبی زمانہ میں لکھی گئی ہیں۔

انشاء اللہ خان اور جرأت کے کلام میں بھی مثنویاں ملتی ہیں۔ راسخ عظیم آبادی نے ۱۹ عدد مثنویاں لکھی ہیں۔ ان تمام مثنویاں واردات عشق میں میر تقی میر سے ملتی جلتی ہیں جیسے (۱) اعجاز عشق (۲) ناز و نیاز (۳) حسن و عشق (۴) کشش عشق (۵) مکتوب عشق (۶) جذبۂ عشق (۷) گنجینۂ عشق وغیرہ۔

کیا کہوں آہ! محبت کیا ہے
کیا کہوں اس میں مصیبت کیا ہے

سعادت یار خان رنگین نے بھی کئی مثنویاں لکھی ہیں جن میں "مظہر العجائب، مثنوی در بار سیر باغ وغیرہ خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ جعفر علی حسرت کی ایک مثنوی "طوطی نامہ" بھی شائع ہو چکی ہے۔ مومن کی شاعری میں کل آٹھ مثنویاں ملتی ہیں۔ جن میں نالہ شکایت، ستم خام، جذبۂ نالۂ بیم وغیرہ۔

حیدر علی آتش لکھنوی کے مشہور شاگرد پنڈت دیا شنکر نسیم نے مثنوی "گلزار نسیم" لکھی ہے۔ یہ مثنوی ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ مثنوی دبستان لکھنؤ کی ایک شاہکار ہے اس مثنوی میں تاج الملوک اور گل بکاؤلی کے عشق کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

مرزا شوق لکھنوی کو مثنوی نگاری کی وجہ سے ہی شہرت ہے۔ ان کی تین مثنوی زہر عشق، بہار عشق اور فریب عشق مشہور ہے۔

دورِ جدید میں نیچرل شاعری کا جب رجحان پیدا ہوا تو مولانا حالی، آزاد اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھی ہیں۔ علامہ اقبال کے یہاں بھی مثنوی ملتی ہے اسرار خودی، رموز بیخودی فارسی مثنوی ہے۔ کچھ مثنوی طرز کی نظمیں ہیں جیسے "گورستان شاہی" "والدہ مرحومہ کی یاد میں"۔

حفیظ جالندھری نے "شاہنامہ اسلام" اردو کی بہترین مثنوی لکھی ہے جو طویل اور خاص مقصد کے تحت لکھی گئی ہے۔ لیکن یہ فردوسی کی شاہنامہ کی طرح مقبول نہ ہو سکی۔

اردو مثنویوں میں ہندوستان کی طبعی حالات اور موسموں کی تعریف، حیوانات، چرند پرند کے تذکرے بھی جا بجا ملتے ہیں۔ ہندوستان کی مختلف تہذیب کو ہمالیہ اور بندھیاچل کا تذکرہ بھی داخل ہے۔ مثنویوں میں عام طور پر مقامی رنگ، ماحول اور سماج کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ عام مثنویوں میں مذہبی، تاریخی اور عشقیہ مضامین کی کثرت ہے۔